''آپ مجھے اپنی رپورٹیں دے دیں۔ میں انہیں لے کر کراموِیل ہسپتال ابھی پہنچا دیتا ہوں۔'' اُس نے ڈاکٹر حی کی اور رپورٹوں کے ہمراہ ایکس رے اور بلڈ کاؤنٹ کی باقاعدہ دن وار تفصیلات بہم پہنچائیں۔

''آپ ہسپتال جانے کی کوشش نہ کریں۔ میں کل تک آپ کو ڈاکٹر سے ٹائم لے کر بتا دوں گا۔''

اس کے بعد ہم Edgeware Street گئے۔ یہاں ثویلہ اور انیس موجود تھے۔ وہ کراچی سے آئے تھے۔ چونکہ انیس میاں Manager Agreements and Handling تھا۔ اس لیے اُسے بی آئی اے کی ٹکٹ اور رہائش ملی ہوئی تھی۔ ثویلہ نے ہمارے لیے بڑا عمدہ پلاؤ اور آلو گوشت تیار کر رکھا تھا۔ مزے لے کر اس کے بعد وہ ہمیں ایک سنڈے مارکیٹ میں لے گئے۔

یہ مارکیٹ ایک پاکستانی مہاجر لگاتا تھا۔ اِدھر اُدھر سے ہر عمر اور سائز کے کپڑے خرید لاتا اور اسے بڑے اچھے داموں پر بیچ دیتا۔ اب تو پاکستان میں بھی اتوار بازار جمعہ بازار ایک عام چیز ہے لیکن تب یہ ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ میں نے واپسی پر کچھ سوت تحفے میں دینے کی غرض سے خریدے۔ ثویلہ اور انیس نے مجھے خاں صاحب کو چند سوٹ خرید دیئے۔ میں جانتی تھی کہ انیس کی تنخواہ زیادہ نہ تھی۔ میں اصرار کرتی رہی کہ یہ فضول خرچی ہے۔ باز آ جاؤ لیکن مجھے خوف تھا کہ بارہ سو روپے کی تنخواہ میں اُس کے پاس اس اسراف کے لیے کہاں گنجائش تھی لیکن انیس بیٹے کی کہ بازار میں وہ اپنے لیے آپ کو کچھ خریدنے نہیں دیتا۔ کبھی کوئی فرمائش نہیں کرتا لیکن آپ کے معاملے میں بغیر نہیں رہتا۔

شام کو اردو مرکز کے کتب خانے میں خاں صاحب کی کتاب ''اُجلے پھول'' کا فنکشن تھا۔ انیس وہاں لے کر گئے۔ لندن کے ادیبوں کا خوب کٹھ تھا۔ زیادہ تر تعریف ہوئی۔ کچھ سوال بغلی گھونسلے جیسے بھی کیے گئے ایسی محفلوں میں ہوتا ہی ہے۔

مشتاق یوسفی صاحب سے یہاں ملاقات ہوئی۔ ابھی انہوں نے ''آبِ گم'' نہ لکھی تھی اور بینکر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے لیکن اُس وقت بھی اُن کی طبیعت کی شگفتگی اور مزاح کی حس نے بہت متاثر کیا۔

دوسرے دن صبح صبح ثویلہ اور انیس ہمارے پاس پہنچ گئے۔ اُن کے ہمراہ Cromwell ہسپتال کے ڈاکٹر خالد حمید سے ملاقات ہوئی۔ اتنی تیز رفتار زندگی اور مصروفیت کے باوجود اُن کے چہرے پر ایک شگفتگی تھی۔ رپورٹیں دیکھ کر وہ شائستہ سی آواز میں بولے۔

''ہماری اور میو ہسپتال کے ڈاکٹر حی کی رپورٹیں ایک سی ہیں۔ ہم آپ کے ڈاکٹر سے اتفاق کرتے ہیں کو بلڈ کینسر ہے..... لیکن ایک اختلاف ہے۔''

خاں صاحب کچھ گھبرا گئے۔

''وہ کیا ڈاکٹر صاحب؟''

''آپ ذرا ڈاکٹر حی سے کہیں کہ وہ ٹائپ رائٹر بدل لیں۔ اگر انہیں پاکستان میں نیا ٹائپ رائٹر یہاں سے بھجوا دوں گا۔''

ہم دونوں کی جان میں جان آئی۔

طے یہ پایا کہ ہم چند دن بعد چرچل ہسپتال میں ڈاکٹر شارپ سے مل لیں۔ وہی کینسر کا علاج کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نے ایک نرس کو حکم دیا کہ وہ میرے بلڈ کا ایک اور سیمپل شارپ کے معائنہ کے لیے لے لیں۔

ابھی ہمیں گھر پہنچ کر انیس اور ثویلہ کو گئے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ تقو آ گیا۔ اُن دنوں وہ عاشق حسین بٹالوی کا دورہ لندن کے گلی کوچے کہ بنگال راجہ تھا۔ چونکہ وہ پیدل اور جوگنگ کا شوقین تھا۔ وہ کبھی نہ سٹریٹ بس لیتا نہ کبھی ٹیوب سے سفر کرتا۔

ابھی ہم حال چال معلوم کرنے کی سعی میں تھے کہ کرومویل ہسپتال سے فون آیا۔ اشتیاق نے فون اٹھایا۔ کچھ دیر سنتا رہا۔ پھر بولا..... ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے پتہ چلا کہ لندن کا پیرا میڈیکل سٹاف اتنا Efficient نہیں جس قدر آپ لوگوں کو سمجھتے ہیں۔''

پھر کچھ دیر دوسری طرف سے کچھ کہا گیا..... اس کے جواب میں تقو بولا ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں تمہاری ڈاکٹر خالد حمید سے نہیں کروں گا لیکن پتہ چلا سسٹر کہ تم لوگ ہم کالے آدمیوں کو کیا سمجھتے ہو۔ بڑی فرعونیت ہے بڑا..... لاتا ہوں لاتا ہوں ابھی۔''

فون نیچے رکھ کر اس نے شتو جی سے کہا..... ''تم نے سسٹر کی حرکت دیکھی۔ پہلے ہی کاکی میں بلڈ کی کمی ہے۔ اوپر سے گر کر سارا بلڈ گرا دیا۔ کہتی ہے مریض کو ہسپتال لے آؤ لیکن ڈاکٹر خالد حمید کو پتہ نہ چلے..... یہ تو لندن والوں کا حال ہے کے پیچھے۔''

خاں صاحب کو تقو ساتھ لے جانے پر رضا مند نہ ہوا۔ ہم دونوں پیدل کرامویل ہسپتال پہنچے۔ تقو کے جانے کے بعد جاوید عبداللہ آ گئے۔ اُس کے ساتھ میں لندن شہر گھومنے پھرنے لگے۔ لندن ٹاور Westminster Abbey۔ سے بکنگھم پیلس دیکھتے چلے گئے۔ دوسرے دن جاوید عبداللہ ہمیں Bond Street لے گئے۔ یہاں Selfridge' مائیکل اور Littlewood کے سٹور دیکھے۔ اُس وقت تو احساس نہ ہوا کہ مغرب مارکیٹنگ کی وبا میں مبتلا ہو چکا تھا۔ جنہوں نے لوگوں کی خواہشات کا بازار گرم کر رکھا تھا اور لوگ بازاروں میں خرید و فروخت کو ایک اہم خوشی سمجھنے لگے تھے۔ صرف زندگی میں در آیا تھا اور لوگ ضرورت بھر اشیاء پر قانع نہ رہے تھے۔

اگلے دن ہمیں نعیم میاں ونڈسر کا قلعہ دکھانے لے گئے۔ پھرتے پھرتے Eton اور Slough کا علاقہ زیر سیاحت آیا۔ واپسی پر انیس اور ثویلہ کو گھر میں موجود پایا۔ اُن کے دو بیگ اور کچھ دستی سامان ساتھ تھا۔

''ابو آپ ذرا اطلاع نہیں دیتے کہ آئندہ کیا پروگرام ہے؟ میں اور ثویلہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہم اب یہیں رہیں گے اور آپ کے ساتھ نتھی ہو جائیں گے۔''

''تم دونوں کیوں اپنی چھٹیاں برباد کرتے ہو۔ ہم مزے میں ہیں۔ جاوید اور نعیم ہمیں خوب سیر کرا رہے ہیں۔ جب چرچل ہسپتال جانا ہوگا ہم تمہیں اطلاع دیں گے۔''

''نہیں نہیں ابو..... اب ہم آپ کو ٹرسٹ نہیں کرتے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔''

دوسرے دن ہم چرچل ہسپتال پہنچے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں میرا Bone marrow ٹسٹ ہو
ڈاکٹر شارپ نے ہم سب کو مخاطب کر کے کہا ''دیکھیے ہم نے مریضہ کو admit کر لیا ہے۔ رات کو انہیں سلاد یا
شوہر حیات ہے؟''

''جی یہ ابو ہیں ہمارے۔''

''پھر یہی رہ سکتے ہیں۔ آپ دونوں جائیے۔ ہسپتال میں ایک آدمی سے زیادہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے
مجھے اندر لیبارٹری میں لے جاتے وقت وہ پھر ٹویلہ اور انیس سے مخاطب ہوا..... ''آپ لوگ جائیں
بے ہوش کر کے ٹسٹ کریں گے..... کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

رات کے وقت مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لایا گیا۔ خاں صاحب کے سامنے بے ہوشی کا ٹیکہ
پھر انہیں جانے کا حکم ملا۔ وہ رات انہوں نے کسی کرسی پر بیٹھ کر گزاری۔

صبح کے وقت جب میری آنکھ کھلی تو ڈاکٹر شارپ اور خاں صاحب پاس کھڑے تھے۔

رات کس وقت Bone marrow ٹیسٹ ہوا مجھے معلوم نہیں۔ یہی ٹسٹ جب میو ہسپتال میں
قدر تکلیف ہوئی تھی کہ الامان۔

ڈاکٹر شارپ نے خاں صاحب سے پوچھا ''آپ واپس کیسے جائیں گے؟''

''کوئی بس لے لیں گے۔''

''آیئے۔''

ڈاکٹر شارپ نے ہمیں اپنی کار میں بٹھایا اور لے چلا۔ کافی دُور جا کر بس سٹاپ ملا۔ ہمیں
صاحب سے مخاطب ہوا ''میں آپ کو گھر پہنچا دیتا لیکن مریض ٹسٹ کے لیے آ چکا ہوگا۔ میں کسی کو انتظار کر
سمجھتا۔''

ایک ہی ٹسٹ کے دوران دو تجربے ہوئے۔ سسٹر نے بغیر کسی معذرت کے اشتیاق کی کسی بات کا
دوسری باریوں لہو کا سیمپل لیا جیسے کسی جانور کا لہو نکال رہی ہو اور اُس ٹسٹ کے دوران ڈاکٹر شارپ جیسا ہمدرد بھی
ہر قسم کا گلہ دھو ڈالا۔ Generalities کے ساتھ Exceptions ہمیشہ رہتی ہیں۔ سائنس کے اصول بھی اس
نہیں۔ ہم افراد کے اختلاف سے نہیں اُن کے Behaviour کے عمومی رویے سے قومی مزاج کو سمجھنے کی کوشش کر
اور غالباً یہاں کسی قوم کو سمجھنے کا بہترین طریقہ ہے۔

کچھ چینی بھی نکھٹو، کام چور اور بھگوڑے ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر وہاں محنت کا راج ہے۔

جاپانی لوگ شائستہ، مہذب اور دوسرے کے آگے کمر جھکا کر تعظیم کرنے کے عادی ہیں لیکن اس عمو
کے ساتھ ساتھ ایسے افراد بھی ضرور ہوتے ہیں، جو بدتمیز تھوتھو کرنے والے اور آپ کو ٹکے ٹنڈ سمجھنے والے ہوتے ہیں۔

لندن میں اب لمبا قیام ممکن نہ تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر شارپ کی رپورٹ ویسی ہی تھی جو ڈاکٹر جی نے دی تھی۔

ان ہی دنوں میں ہمیں امپیریل کالج نے مدعو کیا۔ یہ بھی انٹرویو کی شکل کی ملاقات تھی۔ لندن میں

...زبوں سے آئے تھے لیکن یہاں وہ گرما گرمی نہ تھی جو اردو مرکز کی محفل میں تھی۔ پھر بھی ہماری انا کے لیے یہ شام بھی ...سی بخش تھی۔

اسی سفر کے دوران ہماری ملاقات ایک بڑے ایکٹر بدیع سے بھی ہوئی۔ اس نے پاکستان میں خاں صاحب ...کئی ڈراموں میں شرکت کی تھی۔ اس کے گھر ایک معرکے کی دعوت ہوئی جس میں چند مقامی ایکٹروں سے ملاقات ...۔ اس نے ہمیں ''سکینہ اور سنڈریلا'' کا ٹیپ بھی دیا جسے ہم نے انیس اور ثریلہ کے ہمراہ دیکھا۔ اسی قیام کے دوران ... Ingman Bergman کی Autumn Sonata دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا اور ہم ورلڈ کلاسیک بنانے والے ایک ...سے پہلی بار متعارف ہوئے۔

لوگوں کی اتنی ساری محبتیں سمیٹ کر جب ہم لاہور کے ایئرپورٹ پر واپس لوٹے تو عجب طرح کی اُداسی ساتھ ...صرف ڈرائیور گاڑی لے کر موجود تھا۔

گھر کا کواڑ پھاٹک کھلا۔ ہم اندر داخل ہوئے اور پھر لاہور کے روزمرہ کی لپیٹ میں آ گئے۔

سفرِ دراوڑ

پتہ نہیں کیا تحریک تھی جس کی بنا پر ہم لوگوں نے قلعہ دراوڑ کا رُخ کیا۔ اس سفر میں ہم دونوں کے ہمراہ جمیلہ ہاشمی ...مل تھیں۔ اس قلعے کی حیران کن بات یہ تھی کہ سارے کا سارا مٹی سے بنایا گیا تھا۔ منٹگمری کے علاقے میں ایسا پختہ اور ...ش آپ قلعہ دیکھ کر ہم سب حیرت میں ڈوب گئے۔

اتنی ساری یادیں دھندلا گئیں لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس قلعے کی تصویر کبھی کبھی آنکھوں میں گھومتی ...

ہمیں دراوڑ کے قلعے کے علاوہ ایک اور رانی کوٹ کا قلعہ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جب ہم حیدرآباد میں مقیم تھے ...ں کے کچھ ادیب ہمیں رانی کوٹ کا قلعہ دکھانے لے گئے۔ سارا قلعہ دیکھنا ممکن نہ تھا اس لیے ہمیں ایک کتابچہ بھی عطا ...یا گیا۔ قلعے کا حسن کچھ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں کی پرانی عمارات اور آثارالصنادید ...ساتھ بڑا سوتیلا سلوک روا رکھا گیا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل (ر) خواجہ عبدالرشید مرحوم نے رانی کوٹ کے قلعہ پر ایک اہم ...سپردِ قلم کیا تھا جو ''اقبال ریویو'' (1965ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس قدیم قلعہ پر یہ تحریر اہم معلومات کی حامل ہے۔

سفرِ اوسلو

13 اگست 1983ء کو پورے ساڑھے تین بجے صبح آدھی رات کو ہم اوسلو ہوائی ایئرپورٹ Forne Bu پر ...پہنچے۔ یہاں چند لوگ ہمارے منتظر تھے۔ ہمیں Grandvig Raguar Segard کے علاقے میں پہنچا دیا گیا' جو ...نتھیا گلی سے مشابہ ہے۔ شام کو یہاں کے ادیبوں نے پاکستان کے یوم آزادی کو جشن کی صورت منانے کا پروگرام بنایا تھا ...رخاں صاحب آزادی کی اس Celebration میں صدر تھے۔

شام کو ہمیں قیصر سعید' اُس کی بہن عذرا درانی' سلیم بیگ' اُس کی بیگم شہناز لینے آئے۔ یہ فنکشن رائٹرز یونین ...نے ایک بہت عالیشان محل میں کرایا۔ اس میں مہمانِ خصوصی یہاں کی منسٹر آف جسٹس تھی۔ ہمیں آزادی کی مبارک دی اور

بڑے تپاک سے پیش آئیں۔

اب تقریب رونمائی' آزادی کے فنکشن' ہوٹلوں میں مل جل کر باہمی ستائش کے پروگرام عام سی بات ہے تب یہ معاملات اتنے روزمرہ کا معمول نہ تھے۔ خاں صاحب نے ایسی تقریر کی کہ ہال میں موجود تمام لوگوں نے حیرت ہو کر داد دی۔ ہال بھرا ہوا تھا اور سائیڈوں پر کئی لوگ کھڑے تھے۔ پاکستانی تو موجود تھے ہی لیکن اس شام نارویجین بھی اتنی تعداد میں آئے کہ ہم حیران رہ گئے۔

جب میری باری آئی تو میں نے تقریر میں کہا کہ کوئی معاشرہ بھی جب تک توازن اختیار نہیں کرتا متوازن نہیں ہو سکتی۔ آزادی اور Cooperation دونوں میں Balance نہ ہو تو انسان مختلف قسم کی بیماریوں کا شکار ہوتا ہے۔ مغرب نے اپنے معاشرے کی بنیاد آزادی بنائی ہے۔ یہاں مرد اور عورت اس قدر آزادی کے خواہاں ہیں کہ مرد عورت کا دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ممکن نہیں رہا اس لیے شادی کا ادارہ بے کار ہو گیا ہے۔ بچے جلد خودمختار ہو کر گھر چھوڑ جاتے ہیں حتیٰ کہ نرسری میں اُن کے گلے میں گھر کی چابی لٹکا دی جاتی ہے۔ جونہی بچہ گھر کھول کر اندر جاتا ہے' فریج سے دودھ نکالتا ہے' Cereals ڈالتا ہے اور کھا کر ہوم ورک کرنے لگتا ہے۔ ماں باپ کو "بوڑھے گھروں" میں منتقل کر دیتے ہیں اور کرسمس کے قریب اُن سے ملنے کی گنجائش بنائی جاتی ہے۔

اس طرح حاصل کی گئی آزادی سے جو تنہائی ملتی ہے اُس کا لاکھ علاج تلاش کریں انسانی روح تشنہ رہتی ہے۔ اِدھر مشرق کا معاشرہ خاندانی روایات کا پابند ہے۔ یہاں دو تین پشتیں ساتھ رہتی ہیں۔ مشکلات ہوتی ہیں لیکن روگ' نفسیاتی' ذہنی اور قلبی بیماریوں کو اس طرح فروغ نہیں دیتا جس طرح مغرب میں اس کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

فنکشن کے بعد ڈنر تھا۔ اس کھانے پر میرے دائیں ہاتھ فن تھیسین Finn Thiesen بیٹھے تھے۔ انہوں نے قرآن پاک کا ترجمہ نارویجین میں کیا تھا۔ فن تھیسین Indo i ravsk institut میں پڑھاتے تھے۔ Boks 1035 اور وہ اوسلو کے Blindern کے علاقے میں رہتے تھے خاں صاحب اپنے ساتھ بیٹھی پروفیسر Srennby سے مصروف گفتگو رہے جو کشمیری زبان پڑھاتی تھیں۔ ان سے انہوں نے چند نارویجین حروف سیکھ لیے اور اُن کو بلاتکلف استعمال کرنے لگے۔

ہادیو	Adjq	خدا حافظ
مون	morn	السلام علیکم
تھک	thant	شکریہ

ساتھ ساتھ انہوں نے لڑکیوں کے پرانے اور نئے نام معلوم کیے۔ فیملی نام اور لڑکوں کے نام یاد کیے۔

لڑکیوں کے پرانے نام		لڑکیوں کے نئے نام	
ہیو	Eva	آنے	Anne
انگم بورگ	Ingborag	مونا	Mona
ہلیما	Helma	لیو	Liv

سگرید	Sigrid	تھورل	Toeil
لڑکوں کے نام		**فیملی نام**	
اولاد	Olav	ہانس	Hansen
کھنوت	Knut	اولسن	Olsen
پیر	*Per*	پیٹرسن	*Petersen*
ہانس	Hans	Berg	Berg
		رود	Rud

لڑکیوں کے کام

1- صفائی

2- نرسری میں زبان کی تعلیم

3- فیکٹری

4- دوکانوں پر کام

لڑکوں کے کام

1- ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ

2- فیکٹری

3- صفائی

4- ڈرائیونگ، وکل ٹرانسپورٹ

5- بزنس

خاں صاحب اپنے سفر کو سونا بنانے میں مشغول تھے۔ میں ہمیشہ کی طرح حیرت میں تھی۔ تھسکین نے اپنا تخلص رکھا ہوا تھا۔ اُس نے اسلام قبول نہ کیا لیکن قرآن پاک کا ترجمہ نارویجین میں کیا۔ یہ ناروے میں ہونے والا پہلا ترجمہ تھا۔ تھسکین کئی آیتوں کو زبانی سنا سکتا تھا۔ میں حیران ہوں کہ کس طرح اس شخص نے اتنا کام کیا۔ ساتھ ہی میں خاں صاحب کی تفصیل پسندی پر بھی حیران ہوئی۔ انھوں نے اس کے ساتھ آٹھ دنوں کی ڈائری تیار کی جو آپ کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں۔

خاں صاحب کی تحریر سے اقتباس

ایک خوبصورت گھر میں ایک گھنٹہ گزارنے کے بعد مجھے اپنا ہوائی سفر یاد آ گیا۔ پچھلے دنوں دنیا میں ہوائی زندگی کے سو سال پورے ہونے پر بڑے فنکشن ہوئے۔ سواری کے جہازوں اور فوجی جہازوں کا ڈسپلے ہوا اور ہم نے اخباروں اور ٹی وی پر ایسے ایسے جہاز دیکھے جو پہلے نظر سے نہیں گزرے تھے..... میرے ساتھ ہوائی جہاز کا رشتہ بڑا پرانا ہے مگر اتنی پرانی دوستی کے باوصف ہم میں گہری مناسبت پیدا نہ ہو سکی۔ 1947ء میں پاکستان بننے کے دوسرے ہی مہینے میں ریفیوجی کیمپ میں ہیڈ کلرکی کے عہدے پر فائز تھا.....

گرمیوں کی چھٹیوں میں روم سے میڈرڈ گیا۔ میں تو سپین پہنچ گیا مگر میرا سوٹ کیس کہیں اور چلا گیا۔ کمپنی والوں نے کہا آپ کا بیگ آپ کے ہوٹل پہنچا دیا جائے گا۔ میں ہوٹل کا نام لکھوا کر ہوٹل آ گیا۔ سارا دن تین کپڑوں میں گزارا۔ رات کو زیر جامہ میں سو گیا۔ اگلا دن پھر ایسے ہی۔

کپڑے دھونا..... قرطبہ کا سفر لاری میں صبح منہ اندھیرے چل کر سہ پہر قرطبہ پہنچا۔ وہاں تین دن قیام میں

کپڑے نہیں دھوئے۔ مسجد میں دو وقت آنا ہوتا لیکن کپڑے دھونے کی ضرورت نہ تھی کہ وہاں جماعت ہی نہ ہوتی تھی۔
سامان نہ ہونے کی بدولت آزادی۔ بھلا ہوا میری گھگری ٹوٹی۔
واپسی سفر: ہینگر والے سے کہا اس کے بغیر بھی کام چل جاتا ہے۔
روم میں گھر پہنچ کر دیکھا میرا سوٹ کیس پہلے سے موجود تھا۔ میں پھر چیزوں میں اور سامان میں گھر گیا۔

سفر (اوسلو)

سن 1983ء میں Writers' Union نے مجھے اور خان صاحب کو اوسلو مدعو کیا۔ ناروے کے اس شہر کی عمارتیں گویا آئینہ خانہ تھیں۔ سڑکیں دھلی دھلائی' لوگ شائستہ' سفید اور نرم طبیعت تھے۔

بہت سے ادیبوں سے بھی واقفیت ہوئی لیکن زبان آڑے آئی لیکن Nelga Uafsenl کو ہم اپنی بخاری میں ساتھ لے آئے۔ اس سے Trolls کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے دوران ہمیں پتہ چلا کہ اور اس کی کچھ نظمیں انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکی ہیں۔ ناروے کے لوک روپ میں Trolls بڑی اہمیت رکھتے

ٹرولز ایک قسم کی روحیں ہیں جو انسانوں کی مشکل میں امدادِ غیبی کے طور پر اچانک نمودار ہو جاتی ہیں مشابہت پریوں سے ہے اور وہ کسی Fairy God Mothers کی طرح انسان کو دکھائی پڑتی ہیں۔ ہر خطے نے کی روحانی امداد کی تجسیم کرنے کا خواب ضرور دیکھا ہے.... تاریخ گواہ ہے کہ جغرافیائی تقسیم کے باوجود اس عجیب قسم کی مماثلت ہے۔

Trolls ایک نوعیت کی دیومالائی مخلوق ہیں۔ جیسے جن اور پری کا تصور ہمارے ادب اور لوک میں ہے۔ ان ٹرولز کا کام انسانوں کی مدد کرنا اور مشکل وقت میں اشارے کنارے سے امداد کرنا ہے۔

یہ نظمیں غالباً ستر کی دہائی میں لکھی گئیں اور مجھ تک 1983ء تک پہنچیں۔ یورپ کے یہ لوگ مشین کی برکات اور اس سے پیدا ہونے والی تنہائی سے دنیا میں سب سے پہلے آشنا ہوئے۔ ان کی برف پر انسانی قتل سے نہیں بلکہ انسان کے آئیڈیلز کی ٹوٹ پھوٹ سے بہہ نکلیں۔

میں نے یہ نظمیں اس لیے پسند کیں کہ ابھی ہم نے Perfection کی دوڑ میں حصہ نہیں لیا تھا ہم کے آگے بیٹھ کر کار ریس' سونامی کے سیلاب' زمانے بھر کے اشتہار نہیں دیکھتے تھے۔ ہمارے بچوں نے سکہ ڈالنا نہیں سیکھا تھا۔ ہم ابھی دیہات کے سوئے ہوئے کلچر' اس کی جہالت' رسم و رواج' مذہب اور اس کی وجہ سے سکون کے آشنا تھے۔

جس کیفیت سے گزر کر یورپین ادب اور ہیلگے جیسے نامعروف شاعر کی نظمیں وجود میں آئیں یہ بیسویں صدی کے آغاز میں یا اس سے کچھ ہی دیر پہلے ملا۔ مشرق کی سخت زمین میں ہل چل رہا تھا۔ تبدیلی آ رہی تھی لیکن ابھی ہمیں شعوری طور پر اس کا کلی احساس نہ تھا۔

1985ء میں جب ہم انگلینڈ سے لوٹے تو ان دنوں میری صحت کا معاملہ اتنا گڑ بڑ تھا کہ خاں صاحب نے

...رچ لائٹ موڑنے کی زحمت نہ کی۔ وہ انجائنا کے مریض تھے۔ شکاگو میں اُن کے کئی ٹسٹ اُن کے بھتیجے ڈاکٹر طارق نے کروائے تھے جن میں ایک ٹسٹ یہ بھی تھا جس میں ایک دوڑتے پہیے پر تیز تیز چل کر اپنے دل کو تھکانے اور اس ...ور ہمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ سن پچاسی سے تین سال پہلے کی بات ہے۔ ابھی میرے بلڈ کینسر کا ...وع نہ ہوا تھا۔

غالباً یہ 1987ء کے شروع میں ہوا۔ ڈاکٹر زبیر اپنی خاموشی' سنجیدگی اور خوفِ خدا کے باعث Misunderstood ...نے کے بہت مواقع بہم پہنچاتے ہیں۔ خاں صاحب کے بھانجے ڈاکٹر جواد ساجد کے اصرار پر ہم ڈاکٹر زبیر کے پاس ...یں پہنچے۔ ہمیشہ کی طرح خاں صاحب نے نہ تو بچوں کو بتایا نہ اپنے کسی بھائی بہن ہی کو اطلاع دی۔ لیکن ہمیشہ کی ...میر خاں کو جانے کیسے علم ہو گیا۔ وہ انجو پلاسٹی کے دوران ہمارے ساتھ تھا۔

مفتی جی کا گونگا مجھ سے بھی نہ بولا۔ بڑے بھرپور ڈرامے تحریر کرنے والے نے اپنی زندگی میں کسی ڈرامے کو دور ...ے دیا۔ وہ جذباتی اظہارِ محبت سے کتراتے تھے۔ انہیں نہ آنسو اچھے لگتے تھے نہ بھرائی آواز میں رُک رُک باتیں..... وہ ...یے بابوں کے عاشق تھے جو ٹانگ amputate کروا لیتے ہیں لیکن ذکر سے زیادہ Anesthesia استعمال نہیں ...ے۔

ڈاکٹر زبیر نے انجو پلاسٹی تجویز کی۔ Anesthesia کے لیے ڈاکٹر طارق بن افتخار کا نام تجویز ہوا تو بولے ...ش! میں بھی صبر اور نماز کی معاونت اختیار کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ لیکن میں بڑا بابا نہیں ہوں۔ وہ تو پورے ہوش ...میں کٹوا لیتے ہیں لیکن اُف نہیں کرتے۔"

ڈاکٹر زبیر نے بڑی مشکل سے اپنی خاموشی کا قفل توڑا اور بولے "آپ کتنے بڑے بابا ہیں؟"

خاں صاحب اپنی ہنسی کی مسکراہٹ کے ساتھ بولے "آپ کو پتہ ہے پٹھان' مغل اور راجپوت عموماً بابے نہیں ...ے۔ ان کی انا کا خول ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ میں بابا ہوں نہیں صرف بننا چاہتا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ سرکاری لیول ...تق ڈے نہ منایا جائے بلکہ میرا عرس ہوا کرے میرے بعد۔ داتا گنج بخش کی طرح..... اتنا بڑا نہیں..... چھوٹا سا ...وہاں دھمال پڑے قوالی ہو..... لوگ اندر باہر نہال ہوں نثار ہوں..... خوش آئیں خوش جائیں....."

ڈاکٹر زبیر باتوں کے عادی نہیں۔ ماتھے پر تکدر کے آثار پیدا کر کے بولے..... "آپ کا کیا خیال ہے یہ ...یں؟..... شرک نہیں؟"

خاں صاحب آہستہ سے مسکرائے' پھر بولے "ڈاکٹر صاحب! جہالت ایک قسم کی سادگی کا نام ہے۔ غریب ...تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ غربت کے باعث زندگی کے Exposure تک نہیں پہنچ پاتے۔ سفر اُن کے بس کی بات ...پھر وہ تحفظ کہاں سے حاصل کریں۔ مینڈک سے تالاب کے بند پانیوں کی لذت بھی آپ چھین لینا چاہتے ہیں۔ ...منڈی کے کوٹھے کی تو اجازت دیتے ہیں کہ اس طرح لوگوں کی جنسی آسودگی Stress اور Frustration کم ہوتی ...آپ روحانی آسودگی حاصل کرنے نہیں دیتے۔

کیا ساری ذمہ داری' بوجھ اور تکالیف کو کسی بابے کی چوکھٹ پر پھینک آنے سے جو اطمینان ملتا ہے وہ قابل

تقلید نہیں۔ بابا امید کا جو دیا جلاتا ہے..... جس اگربتی کا مشام انگیز دھواں چھوڑتا ہے کیا وہ قابلِ نفرین ہے۔ تم نے اُن لوگوں کے چہرے دیکھے جو کسی مزار سے باہر نکلتے ہیں۔ جھولیوں میں، ہاتھوں میں، باسی پھول مکھانے تمام مصیبتوں کے باوجود چہرے پر اُمید کی کرن..... حوصلے کی چمک..... چکروں میں پھنسے ہوئے نادار افراد کیا یہ کم آسودگی ہے؟''

اب ڈاکٹر صاحب نے سنجیدہ سا پکا سا منہ بنا کر کہا..... ''اور وہ جو شرک ہے..... اللہ کی ذات کے ساتھ ملانے کا گناہ..... وہ جو دھاگے باندھتے ہیں۔ مزاروں پر منتیں مانتے ہیں۔ اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کی آس بابے سے۔ وہ سارا تو شرک ہے..... ہے ناں.....''

''لیکن ڈاکٹر صاحب..... پھر انجو پلاسٹی ختم..... اب میں چلتا ہوں۔''

ڈاکٹر زبیر حیران ہو کر بولے ''ہیں، ہیں وہ کیوں؟''

''میں بھی شرک کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے علاج سے میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ حالانکہ مجھے سب کچھ اللہ پر چھوڑنا چاہیے۔''

''لیکن اونٹ کا گھٹنا باندھنا چاہیے اشفاق صاحب!''

''غریب لوگ بھی صرف گھٹنا باندھتے ہیں۔ کچھ واقعی بابے کو خدا سمجھتے ہیں اور حاجت روائی کے ہیں..... لیکن یہ اُن کی مایوسی کی آخری سٹیج ہوتی ہے..... وکیل اور ڈاکٹر رب کے نعم البدل ہیں۔ ان کی طرف کرے ہی کرے۔ ایسے ہی بابا ایک رُخ سے سائل کا حل ہیں۔ رہا شرک کا معاملہ تو یہ رب اور بندے کے ہے۔ ہمیں..... اس کی فکر نہ ہونی چاہیے..... ہاں جی تو کون سا Anesthesia تجویز کرتے ہیں آپ؟''

خاں صاحب جانتے تھے کہ گفتگو اس سے آگے ڈاکٹر صاحب کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے

پتہ نہیں خاں صاحب بابے تھے یا نہیں تھے۔ وہ کشف و کرامات کے متعلق کچھ علم بھی رکھتے تھے نے اُنہیں نمازوں کی پابندی اور وظائف میں بھی زیادہ گھرے ہوئے نہیں دیکھا..... ہاں خلق میں رلے دل نوازی، دلداری اور مہمان داری میں وہ خوب ماہر تھے۔

اگر آپ کبھی کسی ڈیرے پر گئے ہوں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بابے ہمیشہ میل جول پر اصرار کرتے قائم رہیں۔ میل جول میں کمی نہ آئے تو کبوتر کبوتروں کی ہمکابی میں پلے گا۔ کوے اپنے جیسے کوے تلاش کر لیں زانی جوئے باز کو اپنے مطلب کی صحبت مل جائے گی۔ نیکوکاروں کی ہمراہی میں گناہ تو سرزد ہوتے رہتے ہیں گھڑی دُور نہیں ہوتی۔ انسان نیک عمل کے بعد اترا تا تو رہتا ہے لیکن اس شیخی پر احساسِ جرم بھی جلد یا بدیر ہونے

خاں صاحب بھی میل جول پر اصرار کیا کرتے تھے۔ اُن میں ایک خاص خوبی یہ بھی دیکھی کہ جو اُن سے جس کو اُن کی ذرا سی قربت نصیب ہوئی، جو کوئی اُن کی صحبت سے فیضیاب ہوا وہ یہی احساس لے کر اُٹھا کہ صاحب کو جانتا ہے۔ وہی اُن کے قریب تر ہے اور اُسی کی راہ خاں صاحب دیکھا کرتے ہیں۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد جو بھی اُن کی یاد میں شریک ہونے کے لیے آیا اُس نے ایسی کہ

زیادہ قریب کوئی تھا ہی نہیں' جیسے وہ مقربِ خاص اُنہیں جانتا تھا باقی سب تو محض حاشیہ آرائی کیا کرتے تھے۔ جس وہ گلاس بھر سیر ہوئے' جنہیں تواتر سے نصیب ہوا وہ جل تھل کی کیفیت میں یوں آئے' جو اُن کے ساتھ شریک ے انہوں نے بارش میں بھیگنے کا سا احساس پایا۔

"زاویہ" دیکھ کر تو یوں احساس ہوا کرتا ہے جیسے وہ غیب میں بیٹھے ناظرین کا دل موہ لینے میں ثانی نہیں رکھتے وہ لوگ جو منہ در منہ فقط ایک بار ملے' اُنہیں بھی یہی اعتراف کرنا تھا کہ وہی خاں صاحب کے قریب تھے.....

دوسری خوبیوں کا تو مجھے علم نہیں لیکن میل جول کی افادیت اور لنگر کھلانے پر اُن کا اصرار ہوا کرتا تھا۔

غالباً بابے جانتے ہیں کہ انسان دو ضرورتوں کے آگے نہتا ہے جنسی آسودگی اور پیٹ کی بھوک..... ان دو کو پورا کرنے والا احسان کرتا ہے اور باسانی رابطہ قائم کر لیتا ہے۔ جنسی آسودگی کے معاملے میں تو بابے شرع کی پاسداری کرتے ہیں' لیکن کھلانے کے بارے میں اُن کی فراخ دلی کا کوئی جواب نہیں.....

اہتمام کے بجائے انتظام کے قائل ہوتے ہیں۔ جو کچھ گھر پر موجود ہے اس میں پروٹی سجائے اسراف کرنے آرائش کے ساتھ کھانے پلانے کی شرط نہیں۔ اگر گرم روٹی اور اچار مہیا ہو جائے تو یہی لنگر ہے اور بھوکے کو ہے..... امیر کے لیے دال چپاتی اور غریب کے لیے مرغی گوشت لنگر کی اعلیٰ قسم ہے کہ دونوں کے دسترخوان پر یہ ہوتیں۔

ڈاکٹر زبیر کے ساتھ جس صبح انجیو پلاسٹی کا مرحلہ تھا اُس دن میں نے دیکھا خاں صاحب قدرے متفکر تھے۔ انیق نچ میں تھے۔ خاں صاحب' اثیر اور میں ہمیشہ کی طرح میو ہسپتال پہنچے۔ اثیر ابو کے ساتھ تھیٹر کے اندر چلا گیا۔ کر تھیٹر ہی میں اوٹ کر کے بٹھا دیا گیا۔ ڈاکٹر زبیر ہمیشہ کی طرح مجھے نادیدنی منظر سے بچانا چاہتے تھے اس اندر تھیٹر کی ٹیبل کے پاس نہ لے گئے۔

میں نے ہمیشہ کی طرح واقعے سے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں اور ایک مرتبہ بھی اُس سکرین پر نظر نہ ڈالی جس پیٹ آپریشن کا منظر چلا آ رہا تھا۔ میں ہمیشہ سے چھوٹے چھوٹے خطرات کا مقابلہ آنکھیں کھول کر اور بہادری ہوں لیکن جونہی معاملہ میرے بس کا نہیں رہتا میں اس سے ایسی چشم پوشی کرتی ہوں گویا طوطا چشم ہوں.....

غرضیکہ آپریشن ہو گیا۔

لیکن اس کے بعد کچھ سقم کی بدولت لہو رِس رِس کر ٹانگ میں اُترنے لگا اور ساری ٹانگ لہولہان نظر آنے لگی۔

جب اُنہیں بہت تکلیف تھی اور ڈاکٹر جواد اور ڈاکٹر زبیر بہت متفکر تھے' وہ نہ تو فکر مند ہوئے نہ کسی کو پریشان کیا۔ آنکھیں نیچا کر کے پڑے رہتے۔ وقت کا انتظار کرتے اور شاید دل ہی دل میں لہو کے رُک جانے کی راہ دیکھتے۔ انسان صبر کو ڈھال کی طرح استعمال کرتا ہے اور کیسے واویلا مچائے بغیر مشکل کا وقت گزار سکتا ہے یہ اُن ہی کی ترکیب سے سمجھ میں آیا ورنہ منہ پر ایک دانہ نکل آنے پر میں نے لڑکیوں کو روتے دیکھا ہے۔

آخری دنوں میں جب اُن کا وزن لبلبے کے کینسر سے گھٹ رہا تھا وہ عجیب قسم کی بے بسی میں مبتلا تھے۔ مجھے علم تھا

کہ وہ جسمانی تکلیف کو برداشت کرنے کی قوت مدافعت رکھتے ہیں۔ کچھ اور فکر تھی جس کا اظہار وہ کرنا نہ چاہتے
کی پرائیویسی میں دھکم دھکا بغیر دستک دیئے داخل ہونے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔

کبھی کبھی وہ آنکھ کے کونے میں جمع شدہ آنسو پینے کی کوشش کرتے‘ لیکن اندرونی کرب اتنا تھا کہ
آتے اور کانوں کی جانب بہنے لگتے۔ ہم نے اُن کے سامنے کبھی کینسر کا ذکر نہ کیا تھا لیکن غالباً وہ ہم سب سے
بھانپ چکے تھے اور بھلے ہی جانتے تھے کہ جس رسولی کا ڈاکٹر بلال نے سرسری ذکر کیا تھا‘ Malignant ہو
ہوگی۔

رات کے پچھلے پہر قریباً ساڑھے تین کے لگ بھگ میں جوس کا گلاس لے کر اُن کے پاس بیٹھی تھی
انگلیاں ٹھنڈی یخ تھیں۔ میری تسلی کی خاطر وہ مچلے بن کر سو رہے تھے۔

"یہ پی لیں؟"

"کیا؟" بڑی عمدہ ایکٹنگ کے ساتھ خاں صاحب نے آنکھیں کھولیں۔

"جوس..... بڑا اچھا ہے۔ مزے دار۔"

"ضرور ہوگا۔"

"پی لیں۔"

"تم پی لو..... میرا جی نہیں چاہتا۔"

"Ensure لاؤں؟"

"ناں رہنے دو۔"

اُن کی آواز نحیف تھی۔

"سنو قدسیہ! ایک بات کرنا تھی تم سے‘ پتہ نہیں تمہیں سمجھ بھی آئے گی کہ نہیں..... میرے دل پر

"آپ کوشش کر دیکھیں شاید....."

"ویسے تو تم بہت ذہین ہو لیکن یہ تمہاری فیلڈ نہیں۔ عارف دنیا کو ایسی باتوں پر وقت بھی
چاہیے۔"

اس وقت چپ رہنا ہی بہتر تھا ورنہ گفتگو کے بہاؤ میں بھرڑ کا لگ جاتا۔

چند لمحے پنکھے کی آواز آتی رہی

"جب کئی دن قبض رہے تو آدمی کتنے علاج کرتا ہے۔ ترپھلا‘ اسپغول..... معجونیں استعمال کرتا ہے
آرام نہ آئے تو لالہ Duphalac بھیج دیتا ہے۔ فروٹ سالٹ الکاسلٹزر لیتا ہے..... کھانے پینے کو وقت
استعمال کرنے کے بعد باقی پھوک کو جسم اپنے اندر پناہ نہیں دیتا۔ فضلہ رفع کے لیے جسم سٹور ہاؤس بننا نہیں چاہتا
صحت کی جس قدر input ضروری ہے ویسے ہی اس کی output کے بغیر آدمی بے چین ہو جاتا ہے۔ سمجھ رہی ہو
نہیں کرتے ڈاکٹر لوگ پیٹ‘ انتڑیاں صاف کرنے کے لیے، خاص کر آپریشن سے پہلے تو انیما تک بدو

''جی.....لیکن کیا؟''

''ہم سمجھتے نہیں روح میں جو غلاظت جمع ہو جاتی ہے.....وہ وہ وہ....'' اچانک وہ چپ ہو گئے۔ اُن پر نقاہت

برے اعمال کے بعد توبہ روح کو دھو دیتی ہے.....نماز بھی تو غلاظت نکالنے کا طریقہ ہے۔ روزہ' صدقات،

''روحانی قبض کا علاج اتنا آسان نہیں قدسیہ بیگم..... برے اعمال کے بعد جو احساسِ جرم انسان پر غالب آتا
کام کی چیز ہے..... اِسی احساسِ جرم کے باعث بسا اوقات ایک ہی جست میں انسان چور سے قطب بن جاتا
کے آنسو روح کی غلاظت دھو ڈالتے ہیں.....لیکن میں بداعمال کے متعلق نہیں سوچ رہا۔ میں..... میں اس
فرحت کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا جو اتنی آسانی سے اچانک اللہ کے فضل سے مل جاتی ہے۔
میں تو سوچتا رہتا ہوں جو لوگ نیک عمل کرتے رہتے ہیں' جن کی ساری سوچ خدمت خلق میں گزرتی ہے' جن
مرزد ہی نہیں ہوتی۔ درد تبہ جام تو وہاں بھی اکٹھا ہو جاتا ہوگا.....قبض سے تو وہ نیک لوگ بھی خالی نہ ہوں گے۔''

''لیکن..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جو نیک عمل ہی کر رہا ہے اُسے قبض کا کیا خدشہ؟''

وہ ہلکا سا مسکرائے۔ اپنی مخصوص سی دلنشیں مسکراہٹ۔

''زندگی جامد نہیں جانِ من..... اگر نیک اعمال کرنے والا نیک آدمی ایک ہی سطح پر رہ گیا تو اس کے درجات
بلند نہیں ہوں گے۔ وہ ارتقاء کی منزلیں کیسے طے کرے گا؟ وہ تو قبض کی حالت میں مر جائے گا۔''

یہ بات میرے لیے سمجھنا مشکل تھی کیونکہ میں اندر سے متفق نہ تھی۔

''نیک عمل کرنے والے کے اندر ہولے ہولے تکبر کی غلاظت جمع ہوتی ہے قدسیہ..... نماز روزے کا پابند'
شیدائی..... اپنے آپ کو بچا بچا کر چلنے والا..... دوسروں کے ساتھ اپنا مقابلہ کر کے احساسِ برتری میں جانے
میں ہولے ہولے غلاظت جمع کرنے لگتا ہے۔ اُس کی انا میں خود پرستی کے کیڑے چلنے لگتے ہیں۔ اگر نیک بندے
رحمت نہ ہو تو پھر یہ نفس ہی ابلیس کا ساتھی بن جاتا ہے اور تکبر جو شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے اور غالباً شرک
سے ہی جنم لیتا ہے' وہ اس کے خمیر میں داخل ہو جاتا ہے۔ جیسے سارا کھایا پیا لہو میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی یہ
خودستائی' من مانی قلب کو سیاہ کرنے لگتا ہے..... احساسِ جرم اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا..... پھر یہ روحانی قبض کیسے
ہے..... تم نے فرانس اناطولی کی تھائیس پڑھی ہے؟''

''جی جوانی میں کبھی پڑھی تھی۔''

''بس دُعا کرو مجھے اُس روحانی جلاب کی ضرورت نہ پڑے۔ میں کسی تھائیس کا محتاج نہ ہو جاؤں؟''

میں نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ خدا کے لیے اپنے پر رحم کریں..... اپنے آپ کو دوہری تکلیف میں مبتلا نہ

کریں۔ یہ جسمانی کرب کافی جان لیوا ہے۔''

''تم بڑی خوش نصیب ہو قدسیہ! اللہ نے تمہیں سپاٹ راستوں کا مسافر بنایا ہے۔ تم بڑی سادگی سے زندگی بسر کر لیتی ہو..... میرے لیے..... میرے لیے دُعا کرو..... میں نیک ہوں اور نیک اعمال میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

''آپ ورگو (virgo) ہیں ناں..... ہر ورگو کی عادت ہوتی ہے تفصیل میں جانا..... باریک بین چھوٹی تفصیل کو مانجھتے رہنا۔ پلیز تفصیل میں جانا چھوڑ دیں۔''

''بس تم دُعا کر دو۔''

''کر دی۔''

''ایسے نہیں حاجی امداد اللہ کی دعا پڑھ کر..... سب کچھ اُوپر والے کا فضل ہے۔ بد اعمال تو روح تک کرتے ہیں۔ یہ اُلو کی پٹھی نیکی بھی فضل کے بغیر کچھ نہیں..... اپنا قد بڑھانے' شیخی مارنے' سچے کھبے لوگوں کو دکھانے اپنی مثالیں پیش کرنے کے لیے جو نیک اعمال کیے جاتے ہیں وہ بھی انسان کا بھٹہ بٹھا دیتے ہیں۔ کر دیتے ہیں۔''

''آپ نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس پر آپ شرمندہ ہوں۔''

''نیک بی بی نیک مرد میں علم' انکساری عاجزی نہیں رہتی۔ وہ خلق سے اپنے آپ کو بہتر سمجھنے لگتے فرشتہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے پَر ابلیس جیسے ہونے لگتے ہیں..... لیکن تم نہیں سمجھو گی..... تمہاری روح مانگے ہے..... تم صرف دُعا کرو۔''

''جی کر دوں گی۔''

''ایسے نہیں حاجی امداد اللہ مکی کا کن فیکون پڑھ کر..... پوری توجہ کے ساتھ۔''

''ضرور جی۔''

آج کے تمام قابل ذکر ادیب ساٹھ سے اُوپر ہو چکے ہیں اور اس عمر میں پہنچ کر انسان اگر ماضی سوائے یادوں کے کچھ نہیں ملتا۔ اگر مستقبل کی طرف نگاہ اُٹھائے تو فنا کے سوائے کچھ یقینی نہیں۔ ہمارے ایک ایسے مقام پر ہیں' جہاں جوانی کا احساس تو رہتا ہے لیکن ولولے' جوش' Motivation کچھ کر گزرنے نہیں رہتی۔

آج کا ادب وہ لوگ تخلیق کر رہے ہیں جو زندگی سے disillusion ہو چکے۔ سچ پوچھیے تو فکشن بد دلگیری کی فضا میں پلتا ہے۔ افسانے' ناول خوف اور فکر سے لبریز ہیں۔ جب ادیب ماضی کی طرف لوٹتا ہے تو کہ ہے کہ سانپ ایک بار کینچلی سے نکل جانے کے بعد اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔

یادیں پچھتاوے کا رُوپ دھار لیتی ہیں۔ مستقبل کی طرف نگاہ اُٹھانے پر فنا یقینی ہے۔ باقی سب باید..... راضی برضا ہوا نہیں جاتا۔ رجائیت کو زندگی چاٹ جاتی ہے۔ اس بے یقینی میں ادیب ایسا فکشن لکھنے پر مجبور میں خوف' مکر اور زیاں کا احساس خمیر کی طرح رچا بسا ہے۔

لیکن اشفاق احمد نے ہمیشہ ایک اُمید کو اپنے ساتھ رکھا۔ وہ بھی ساٹھ سے اُوپر ہو گئے۔ اُن کے قوائے مضمحل حکیموں ڈاکٹروں پیروں کی دُعاؤں کا آسرا لیا۔ لیکن ضرورتِ بشری تک اُن کی رجائیت کی جان بچانے والی کشتی محبت تھی۔ وہ اس محبت کے ساتھ ہمیشہ Motivated رہے۔ اس تحریک نے انہیں کبھی شیطان کا دوست نہ ہمیشہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے کا درس دیا کرتا ہے۔ انہوں نے کبھی ماضی کو Nostalgia کی نگاہ سے نہ موت کو فنا کا راستہ نہ سمجھا بلکہ یہ جانا آگے چلیں گے دم لے کر۔

پتہ نہیں اللہ کا نظام کیا ہے؟ ہم اپنے قلیل علم کی دُوربین لگا کر لاکھ اس کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہم پر حجاب در کی ایسی دُھند چھائی رہتی ہے کہ آر پار کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ دعائیں کہیں مانگی جاتی ہیں مقبول کہیں اور ہو جاتی ہیں عراق میں مانگی جاتی ہیں افغانستان کا آسمان دعاؤں سے اٹ جاتا ہے لیکن اندھا دُھند وہ امریکہ میں اور کے گھر پر برس جاتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اللہ ساری مخلوق کو واحد سمجھتا ہے اور جو فردِ واحد کے ساتھ بیت جاتی ساری انسانیت کا مقدر ہے۔

دعائیں افتخار عارف مانگتا ہے کہ کسی ایسے شخص کا ساتھ ملے جو مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو۔ میں تو اُس بولوں لیکن وہ ہمیشہ سچ کا دامن تھامے رہے۔ ساری وحشتیں جو لکھنے والے کا مقدر ہوا کرتی ہیں اُن کو برداشت عادی ہو..... ایسی دُعائیں افتخار سے گریاں مجھ تک پوری نمرتا کے ساتھ پوری ہو گئیں۔ خاں صاحب میرے لیے بنے رہے جس پر زندگی کا ہر وار سہہ جانے کی صلاحیت بھی تھی اور حوصلہ بھی۔

پتہ نہیں اشفاق احمد کو زندگی سے بہت پیار تھا یا نہیں۔ وہ قوسِ قزح کے سات رنگوں کی طرح تھے۔ میں جانے Perisc تھی کہ مجھ سے گزر کر تمام رنگ یک رنگ ہو جاتے۔ خاں صاحب کے ہوتے ہوئے میں نے کبھی کسی رشتہ دار مددگار کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ کبھی کبھی تو مجازی خدا کے ہوتے ہوئے اصلی خدا بھی یاد نہیں آیا اور شاید کے باعث مجھ سے یہ نعمت چھن گئی۔

اشفاق احمد میں بغیر قریب ہوئے دوسرے کو قربت کا احساس دلانے کی بڑی خوبی تھی۔ وہ جس کسی کے ساتھ سے اسی وہم میں مبتلا کر دیتے کہ بس مجھ سے ہی اُن کا رابطہ ہے باقی سب تو اضافی تھے۔ لیکن ہر عمل کا ایک ردِ عمل ہے۔ اُن کی مخلوق نوازی بندہ پروری غمگساری جو وہ اپنے ملنے والوں سے برتتے تھے اس کا ردِ عمل اُن کے بچوں تھا۔

ایک واقعہ یاد آیا۔ برکلے پروگرام کے تحت خاں صاحب امریکہ گئے۔ ابھی اثیر خاں بمشکل پاؤں پاؤں چلنا اور پہلا لفظ جو اُس نے بولنا سیکھا وہ ''بتی'' تھا۔ جب بھی دروازے پر کوئی دستک دیتا یا اُسے کسی چیز کی تلاش ہوتی بتی'' کہتا بھاگتا آتا۔ خاں صاحب کو بچے چھوڑ کر برکلے جانے کا بڑا رنج تھا لیکن انہوں نے کبھی اس بات کا اظہار اشفاق احمد نے اس بھاگتے ''بتی بتی'' کہتے اثیر کو ریکارڈ کر کے اس کا ٹیپ محفوظ کر لیا۔

اشفاق احمد اندر کا موسم بتانے سے قاصر تھے۔ وہ بتی کی طرح چپ چپ گھلتے رہتے۔ غم کو لیمن ڈراپ کی طرح بچے۔ کڑوی کافی، کریلے کی بھجیا اُن سب کو اس کے Bitter Sweet ذائقہ کی وجہ سے وہ بہت پسند کرتے تھے۔

پھر ایک اور واقعہ ہو گیا۔

میرے منجھلے بیٹے انیس خاں نے ایک کبوتر کا پَر مجھے پکڑا کر کہا..... ''امی! یہ میری طرف سے ابو کو
خط میں ملتا تھا کہ خاں صاحب نے نگری نگری پھرنا بند کر دیا۔ رنگ برنگی کلاس جس میں جیکولین کینیڈی بھی
کلاس کو خاں صاحب نے ان گنت کہانیاں سنا کر اپنا عاشق کر رکھا تھا' ان سب کو چھوڑ چھاڑ وہ گھر لوٹ آئے۔
شاید ایسے لوٹنے کی لذت سے آشنا تھی۔

خاں صاحب بھی جہاں گئے کیسے ہی گم کیوں نہ ہوئے ہمیشہ لوٹ آئے۔ لیکن اظہار کی کمی نے
کبھی باپ کی محبت سے آشنا نہ ہونے دیا۔ لوگوں نے ہمیشہ اُن پر ایسا قبضہ جمایا کہ بچوں کو علم نہ ہو سکا کہ
شفقت میں کتنی حدت ہے۔ جو لوگ کم وقت کے لیے ملتے تھے' جن کو اپنا وزن خاں صاحب پر منتقل کرنا ہوتا
کو اپنے Catharsis کے لیے استعمال کرنا ہوتا۔ وہ اتنا وقت ہی نہ چھوڑتے کہ بچے اُن کے قریب آ سکتے۔
بڑے آدمیوں کا المیہ ہے۔

خاں صاحب کی تپائی پر بیماری کے دنوں میں یہ ورق پڑے رہتے تھے۔ وہ کبھی کبھی پڑھ
لیتے تھے۔

اشفاق احمد

از نورالحسن

اشفاق صاحب بڑی تخلیقی قوتوں کے مالک تھے۔ اُن کی رنگا رنگ تخلیق کاری نے عجب گل
چھوٹے سے تھے تو اُنہوں نے ایک رسالہ نکالا۔ اسے وہ خود ہی لکھتے' اس کی کاپیاں بناتے اور
جماعت دوستوں میں بانٹ دیتے۔

پاکستان پہنچ کر جب اُنہوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تو ایم اے اُردو کے دوران ہی
''ایک محبت سو افسانے'' آ گئی۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ روم چلے گئے۔ واپسی پر خاں صاحب نے
لکھنا شروع کر دیا جو پورے 39 برس آن ایئر گیا لیکن اُن کی تخلیقی قوتیں ''تلقین شاہ'' کی سرحدوں کو پار کر

پہلے خاں صاحب نے ریڈیو پر ڈرامے لکھے پھر جونہی ٹیلی ویژن 1964ء میں ہماری زندگی
نے اس میڈیا کو اپنا لیا۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے بڑی عمدہ کمپیئرنگ کی۔ ٹیلی ویژن کے افتتاحی پروگرام
اُن ہی کے سر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کی موسیقی سے گہری دلچسپی نے ''نکھار'' جیسے پروگرام دیئے۔

''زاویہ'' سے تو آپ کی ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خاں صاحب
مختلف طبقوں میں اتنی ہی رنگا رنگ ہے جس قدر اُن کی شخصیت..... جو پڑھے لکھے افسانے سے دلچسپی رکھتے
تھے کہ خاں صاحب صرف افسانے لکھیں..... اور وہ بھی ''اُجلے پھول'' اور ''ایک محبت سو افسانے'' جیسے
افسانے'' سے اُنہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ جنہیں ''تلقین شاہ'' سے عشق تھا وہ اُنہیں کسی اور رُوپ میں دیکھنا نہ چاہتے

"زاویہ" دُور دُور پھیلا اور الیکٹرونک میڈیا ہونے کی وجہ سے اس کی پذیرائی بھی زیادہ ہوئی۔ میرا کہنے کا مقصد
ہر چاہنے والا اپنی پسند کا تابع ہو کر مُصر تھا کہ صرف وہی ٹھیک ہے۔ لیکن آج تین سال گزر جانے کے بعد مجھ پر یہ
کہ خاں صاحب سے اُن کے چاہنے والوں کی وابستگی کم نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ قارئین' ناظرین کی محبت ہے۔ محبت
جذبہ ہے جو کسی عمل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اچھائی برائی' کمی بیشی' اونچ نیچ محبت کے سامنے بے معنی ہے۔ محبت کو
لیے خدا کا سب سے بڑا رُوپ کہا جاتا ہے۔

محبت کرنے والا محبوب کی خرابیاں نہیں دیکھ پاتا بلکہ اُن کو اپنی خرابیوں کی طرح قبول کر لیتا ہے۔ ڈیروں پر اسی
نظر آتا ہے اور خاں صاحب غالباً اسی محبت کی تلاش میں بابوں کے پاس آنے جانے لگے تھے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگ محبت نہیں کر سکتے۔ انہیں اپنی ذہانت پر زیادہ مان ہوتا ہے۔ وہ دوسروں میں
کر کسی اور کا قد چھوٹا کر کے' کسی دوسرے کی خوبیوں میں خرابی کا پہلو نکال کر اپنی کلا جگاتے ہیں۔ میں یہ نہیں
خاں صاحب فرشتہ تھے۔ اُن میں یقیناً انسان ہونے کے ناطے خوبی اور خرابی دونوں کے دریا ساتھ ساتھ بہتے

یقیناً اُن میں حبِ مال اور حبِ جاہ کی طلب ہوگی لیکن وہ کسی صوفی کی طرح جہادِ نفس میں مبتلا رہتے تھے۔
میں نہیں۔ اُن کی زندگی میں ضروریات کو پنکھی جھل کر دہکانا ضروری نہیں۔ بھڑکی ہوئی آگ کو بجھانا اہم تھا۔

پچھلے سال 4 ستمبر 2007ء کو برسی کے موقع پر پی ٹی وی والوں نے انٹرویو لیے۔ فرحان مشتاق پروڈیوسر تھے۔
بھی تھے اور افسردہ صورت بھی۔ سارے ہی آہیں بھرتے بہ چشمِ نم سٹوڈیو میں داخل ہوئے۔ فرحان مشتاق نے
کے شروع میں کہا.....

تین مرتبہ ایسے ہوا تھا

میرا دل اُن کو دیکھ کے زور سے دھڑکا تھا۔

پہلی مرتبہ اُس وقت تھا' جب لاہور ایئر پورٹ پر بوئنگ 737 کسی وجہ سے بڑے ایپرن کے بجائے جمبو Boy
تھا۔ پرانے ایئر پورٹ پر جہاں حاجی کیمپ کی سفید رنگ کی چھوٹی سی عمارت تھی' اُس کے بالکل سامنے ایک لمبا
اس ٹاور سے نکلنے والی زرد روشنی ہمیشہ مجھے ایک عجیب اُداسی بھرے رومانس سے بھر دیتی ہے۔ اسی ٹاور کے ذرا
طرف بوئنگ 737 آ کے رُکا تھا۔ سیڑھی والی گاڑی جہاز سے لگ چکی تھی۔ میں جب تک جہاز کے تینوں پہیوں میں
لگا کر سیڑھی تک پہنچا مسافر اُترنا شروع ہو چکے تھے۔ پھر اچانک وہ نظر آ گئے۔

میرا دل زور سے دھڑکا

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ

جہاز کے دروازے کو چھوڑتے ہوئے بالکل ہولے سے اُن دونوں نے سیڑھی پر قدم رکھا۔ میں جو نیچے زمین پر
سے ذرا پیچھے مبہوت کھڑا تھا' دو قدم اور پیچھے ہو گیا۔ اشفاق صاحب نے بانو قدسیہ کی کلائی اس طرح تھامی ہوئی

تھی بالکل پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کس نے کس کو سہارا دیا ہوا ہے۔ بانو قدسیہ آپا نے سفید دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا
دھیرے دھیرے نیچے اُتر رہے تھے۔ زرد روشنی اور جہاز کے نیم تاریک بیک گراؤنڈ میں وہ دونوں اس وقت
تھے جس طرح کسی سلطنت کا درویش بادشاہ خاتونِ اوّل کے ساتھ اُترتا ہے۔ میرا دل چاہا کہ اِدھر شہنشاہ
اُترے اُدھر میں پروٹوکول آفیسر کی طرح کڑکتا ہوا سلیوٹ کروں۔ لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اشفاق صاحب
ساتھ میرے قریب سے گزر کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں سٹوڈیو میں تھا۔ سنٹرل پروڈکشن یونٹ لاہور کی ڈپٹی
انجم بھٹی نے مجھے کہا میرے کمرے میں اشفاق صاحب بیٹھے ہیں۔ انہیں سٹوڈیو میں لے آؤ۔

یہ دوسری مرتبہ تھا کہ میرا دل زور سے دھڑکا تھا۔

میں انتہائی خوشی خوشی قدرے اضطرابی حالت میں کمرے میں پہنچا۔ ایک بوڑھا شخص کرسی پر ٹیک
بیٹھا تھا۔ اُس کی نظریں جیسے کسی سوچ میں تھیں۔ میں نے کہا "سر! ریکارڈنگ کے لیے چلیں؟" میں نے اشفاق
کے سنگ سنگ 45 یا 50 سیکنڈ کی مسافت طے کی۔ کتنے سوال، کتنی کتابیں، کتنے اغلاط تھے جو میں پوچھ سکتا تھا
اُن کا مزاج بھی نہ پوچھ سکا۔

مجھے پروگرام منیجر طارق احمد صاحب نے بلایا اور ایک چھوٹی سی فہرست ہاتھ میں تھما دی کہ یہ انٹرویو کر

میرا دل زور سے دھڑکا

یہ تیسری مرتبہ تھا

فہرست کے سب سے اُوپر لکھا تھا۔ بانو آپا

میں نے جو کچھ اس انٹرویو کے دوران کہا، حاضر خدمت ہے۔

میں نے خاں صاحب کے ساتھ زندگی کا ایک لمبا وقفہ گزارا۔ اُن کو بہت قریب سے دیکھا۔ فاصلے سے
کیا۔ بارہا یوں ہوا کہ مجھے اُن کے عمل، سوچ اور رویہ سے اتفاق رائے نہ تھا لیکن ایک بات میں گورنمنٹ کالج
جب ہمیں اکٹھے ایم اے اُردو کرنے کا اتفاق ہوا۔ خاں صاحب کی نیت ہر مقام پر بے داغ رہتی۔

کسی شخص کو سمجھنے کے لیے تمام تر تجربے، مشاہدات، تخیل، احساس کے باوصف اُس کی سمجھ نہیں آ سکتی
کی سرچ لائٹ بھی پڑتی ہو تو انسان کے کونے کھدرے ایسے رہ جاتے ہیں جن میں کئی خوبیاں اور خرابیاں چھپ
انسان کا پتھر اور دھات کے زمانے سے اب تک یوں چلتے چلتے آنا غالباً اسی گپت چھپے رازوں کی بدولت ہے
ہر مقام پر قلیل رہتا ہے۔ غالباً اسی لیے اعمال کو تولنے جانچنے کے لیے نیت سے بڑا کوئی Catalyst نہیں
بدنیتی پر معمول ہوتی ہے اور کبھی کبھی رابن ہڈ جیسے لٹیرے بدی کے سر پر کامیابی کا سہرا لگا دیتے ہیں۔

اشفاق صاحب نے اُردو بورڈ میں سروس کی۔ یہاں کئی ماتحتوں کو ڈانٹا برا بھلا کہا ہوگا لیکن یقیناً
ڈسپلن کے تحت، مارے باندھے کیا ہوگا۔ کبھی کسی کی اے سی آر خراب نہ کی ہوگی۔ اُن کے جانے کے بعد مجھے

...کی مالی اعانت وہ کرتے رہے لیکن کبھی مجھے بھی نہ بتایا۔

اُنہوں نے ریڈیو ٹیلی ویژن پر کئی پروگرام کیے۔ یقیناً یہاں بھی آویزش کے سلسلے ہوں گے خاص کر ''تلقین ... ریکارڈنگ کے دوران کاسٹ زیرِ عتاب آتی ہوگی لیکن بعدازاں اُن ہی کاسٹ کے بندوں کے ساتھ بیٹھ کر ... پیچے' خوش گپیاں جاری ہو جاتیں۔ اگر اُن کی نیت میں کھوٹ ہوتا تو اُن کے جانے کے بعد اُن کے ساتھ کام کرنے ... انہیں اس طرح یاد نہ کرتے جیسے اب کرتے ہیں۔

گھر پر اُن کا رویہ ملازموں کے ساتھ ایسا تھا کہ جو ایک بار آ گیا وہ اُن کی زندگی میں پھر انہیں چھوڑ کر نہیں گیا۔ ...ہی پڑ جاتی۔ سوال جواب کی نوبت کبھی نہ آتی۔ حجام، قصائی، دودھ والا، سبزی والا ملازمین جس طرح یہ لوگ انہیں ... اور روتے ہیں اس کی مثال کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

اور اس کی یہی وجہ ہے کہ اُن کی نیت آئینے کی طرح صاف تھی اسی لیے وہ تادیر کسی انسان سے ناراض نہیں رہ ... رشتے ٹوٹ جانے پر حیثیتیں بدل جانے پر اپنا اپنا راستہ اور اپنا اپنا منہ لے کر رخصت ہو جانے پر بھی اُن کی نیت ... ڈول نہ ہوتی۔ شاید اسی لیے وہ کبھی منافقت کے شکار نہ ہوئے۔ غلطی سرزد ہو جاتی۔ بڑی شرمساری سے اعتراف ... اچھائی کر بیٹھتے تو سر جھکا کر جھینپی سی مسکراہٹ کے ساتھ خوش ہو جاتے۔ اسی نیت کی بدولت نہ اُن کی تحریر میں کبھی ... آیا نہ ہی زندگی میں۔

مجھے اُن کے برعکس دیہات سدھار کا اتنا شوق ہے دوسروں کو ٹھیک کرنے کا ایسا لپکا ہے کہ اپنے آپ کو ٹھیک ... سارے جہاں کو مشورے دیئے جاتی ہوں۔ مجھے خاں صاحب سے ایک گلہ ہے کہ جہاں اُنہوں نے مجھے لکھنے ... کی تعلیم دی وہاں مجھے بابوں کی یہ تربیت دیتے کہ جہادِ نفس کیسے کرتے ہیں؟ اور ہر گرم و سرد میں اپنی نیت کے ... کو سیدھا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

لوگ لوگ

محمد یحییٰ خاں

محمد یحییٰ خاں کالے کپڑوں میں ملبوس گلے میں موٹے منکوں کی مالائیں سجائے، لمبی لمبی زلفوں [illegible] چھپائے ایک عجوبہ روزگار شخصیت ہیں۔ ان کے اندر اور باہر واضح طور پر دو راستے ہیں۔ پتہ نہیں یحییٰ خ[illegible] ہے۔ اگر وہ درویش ہے تو دوسرا ادیب کون ہے جو اس وقت پاکستان کے جملہ ادیبوں میں اتنے منفرد سٹائل [illegible] چوٹی پر ہے۔ اس کے ادب کا رجحان منٹو کی طرح ایسے لوگوں کو رفعت بخشتا ہے جو سوسائٹی میں عزت کے [illegible] کی کہانیاں، مشاہدے سے زیادہ تخیل کی مرہونِ منت ہیں۔ یحییٰ خاں نے نگر نگر، دیس دیس ہر مسلک [illegible] سے دیکھا اور اپنے مشاہدے سے وہ ادب تخلیق کیا جو قاری کے لیے ہوشربا ہے۔

یحییٰ خاں کا بہت پہلے سے اشفاق صاحب سے ملنا ملانا تھا۔ وہ خاں صاحب کے پیروں پر سجد[illegible] برا لگتا کیونکہ میرا خیال ہے سجدہ فقط اللہ کے لیے ہے لیکن خاں صاحب کسی اور سمت کے آدمی تھے۔ وہ [illegible] گناہ کی بوجھ بڑے شوق سے اٹھاتے۔

وجدان و حقیقت، ہنی سنائی اور دان بیتی یحییٰ خاں کی کہانیاں ہر سمت کی کہانیاں ہیں۔ مجھے سب [illegible] ان کی کتاب ''پیا رنگ کالا'' کی معرفت ہوا۔ یحییٰ خاں نے فرمائش کی کہ میں اس کتاب پر کوئی رواں تبصرہ [illegible] پڑھنے کے بعد میرے چھکے چھوٹ گئے۔ اے کلاس ادب پر کوئی بی کلاس لکھاری کیسے لکھے اور کیا لکھے۔

اشفاق صاحب کے جانے کے بعد بہت سے لوگ میری دلجوئی کے لیے آتے رہتے تھے۔ ان میں [illegible] اور ان کے بیٹے بھی ہوتے۔ بہت جلد مصیبتوں کے مارے لوگوں نے ہمیں ڈرائنگ روم میں یحییٰ خاں کے [illegible] عقیدت بنا لیا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ لڑکیوں کو سر پر دوپٹہ لینے پر مجبور کرتے۔ نئے عہد کی عورت اس پابندی سے [illegible] حاصل کر چکی تھی۔ وہ لباس کے معاملے میں خود مختار تھی، نہ چھوٹی آستین کی قمیض ہی اسے کاٹتی تھی۔ نہ کھلے [illegible]

بچے کا لباس۔

دوسری بات جو میرے لیے ناقابل برداشت تھی وہ میں نے یحییٰ خاں کو بتادی۔ وہ مجھے سجدہ کرتے تھے، اسی لیے میں نے انہیں داستان سرائے آنے سے منع کر دیا۔ اب وہ کم کم آتے ہیں۔ پوٹلی کھول کر ملازمین کو ڈھیر سارے پیسے دیتے ہیں۔ مٹھائیوں کے ڈبے بانٹتے ہیں اور راضی برضا چلے جاتے ہیں۔

بابا محمد یحییٰ خاں ولد محمد عمر خاں، سیالکوٹ (موری دروازہ) میں پیدا ہوئے۔ اپنے آبائی شہر میں چوتھی جماعت (نامکمل) تک تعلیم حاصل کی۔ دو شادیاں کیں۔ ایک ناکام اور دوسری کامیاب۔ دو بیٹوں اور چار بیٹیوں کے باپ ہیں۔ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مثلاً من مندر۔ من مسجد۔ شب دیدہ۔ موم کی مورت۔ گل شبو۔ آہ آ ہو۔ پیا رنگ کالا۔

مرزا ادیب

مرزا ادیب بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے کبھی یہ خیال نہ کیا کہ اشفاق احمد مجھ سے بہت جونیئر ادیب ہے، مجھے اس سے کیا ملنا پھرنا۔ وہ ہمارے گھر آتے تو ان کے آنے جانے کا پتہ نہ چلتا۔ ایک دو مرتبہ مجھے بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ مرزا ادیب منشی پریم چند کی کیٹگری کے ادیب ہیں اور ان کو ماڈرن تنقید کی تول تکڑی پر تولا نہیں جا سکتا۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد بھی مرزا جی نے مجھ سے رابطہ رکھا لیکن احترام کے باعث میں اس میں بے تکلفی پیدا نہ کر سکی۔ یہ بھی عجب طور ہے کہ احترام بھی ایک بہت بڑا حجاب بن جاتا ہے اور رابطہ مضبوط نہیں ہونے پاتا اور اگر مضبوط نہ ہو تو بھی رابطہ کھل کھلا کر، دروپدی کی ساڑھی بن جاتا ہے جسے لپیٹنا ہر بندے کے بس کا نہیں۔ بس یہاں وہاں ہر جگہ توازن کی ضرورت رہتی ہے جو رشتے ناطوں میں وقت کے ساتھ ساتھ مضبوطی پیدا کرتا چلا جائے۔ مجھے مرزا ادیب کی سرگزشت تحریر بہ عنوان ''مٹی کا دیا'' بہت پسند ہے کیونکہ اس میں انہوں نے خود انتہائی دلچسپ اور خوبصورت انداز میں اپنے حالاتِ زندگی بیان کر دیے ہیں۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

صوفی تبسم 4 اگست 1899ء کو امرتسر (بھارت) میں پیدا ہوئے جہاں ان کے بزرگ کشمیر سے آ کر آباد ہوئے تھے۔ والد کا نام صوفی غلام رسول اور والدہ ماجدہ کا نام فاطمہ تھا۔ صوفی تبسم کا نام غلام مصطفیٰ رکھا گیا۔ صوفی تبسم نے جو عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں گزارا وہ 23 برسوں پر محیط ہے۔ 1931ء سے 1954ء تک وہ اس کالج میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے اور بے انتہا خدمات انجام دیں۔ ایک ڈرامیٹک سوسائٹی بنائی جس کے تحت شیکسپیئر کے کئی ڈرامے ترجمہ کر کے